رسائل و مسائل

مزاج شناسِ رسول

سوال :۔ مرزائی، منکرینِ حدیث اور بعض دوسرے لوگ اس بات کا بہت چرچا کرتے ہیں کہ مولانا مودودی نے مزاج شناسِ نبوت ہونے کا دعویٰ کیا ہے اور کہا ہے کہ اس مزاج شناسی کے بل پر وہ ذخیرۂ احادیث میں سے جس حدیث کو چاہیں صحیح اور جس کو چاہیں غلط قرار دے سکتے ہیں۔ ان لوگوں کی طرف سے حال میں یہ بات بھی پھیلائی گئی ہے کہ جماعت اسلامی کے ارکان اور ہمدرد بھی مولانا مودودی کے اس دعوے کو تسلیم کرتے ہیں۔ چنانچہ ان معترضین کے بقول، پنجاب کی تحقیقاتی عدالت میں مولانا اصلاحی صاحب نے بھی اس دعوے کو مان لیا ہے۔ اعتراض کرنے والوں کا کہنا یہ بھی ہے کہ یہ دعویٰ ایک طرح کا ادّعائے نبوت ہے کیونکہ مرزا غلام احمد صاحب نے بھی یہی کہا تھا کہ میں احادیث کے ڈھیر میں سے جسے چاہوں لے سکتا ہوں اور جسے چاہوں رد کر سکتا ہوں۔ براہِ کرم اس بارے میں اصل حقیقت سے مطلع فرمائیں تاکہ صحیح رائے قائم کی جا سکے۔

جواب :۔ آپ نے جس بہتان طرازی کا ذکر کیا ہے اس سے ہم ناواقف نہیں ہیں۔ جماعت اسلامی کے خلاف فتنہ پردازی کی وسیع مہم کا ایک شوشہ یہ بھی ہے۔ چونکہ آپ کا سوال یہ ظاہر کرتا ہے کہ اس بارے میں پوری معلومات آپ کے سامنے نہیں ہیں اس لیے آپ کے اطمینان کی خاطر مختصر جواب دیا جا رہا ہے۔ سب سے پہلے مولانا مودودی کی وہ دو عبارتیں نقل کر دینا مناسب ہوگا جسے بنائے دعویٰ ٹھہرایا گیا ہے۔ وہ "تفہیمات" کے دو مضامین "قرآن و حدیث" اور "مسلکِ اعتدال" کی ذیل کی عبارتیں ہیں :۔

"حدیث کو اصولِ درایت پر وہی شخص جانچ سکتا ہے جس نے قرآن کا علم حاصل کر کے اسلام کے اصول اور اس کو خوب سمجھ لیا ہو اور جس نے حدیث کے بیشتر ذخیرے کا گہرا مطالعہ کر کے احادیث کو پرکھنے کی نظر بہم پہنچائی ہو۔ کثرتِ مطالعہ اور ممارست سے انسان میں ایسا ملکہ پیدا ہو جاتا ہے جس سے وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مزاج شناس ہو جاتا ہے اور اسلام کی روح اُس کے دل و دماغ میں بس جاتی ہے۔ پھر وہ ایک حدیث کو دیکھ کر اول نظر میں سمجھ لیتا ہے کہ آیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایسا فرما سکتے تھے یا نہیں یا آپ کا عمل ایسا ہو سکتا تھا یا نہیں؟"

"معاذ اللہ اس کے یہ معنی ہرگز نہیں ہیں کہ یہ لوگ (یعنی ائمہ مجتہدین) کسی حدیث کو صحیح جان کر اس سے انحراف کرتے تھے۔ نہیں، بلکہ اصل معاملہ یہ تھا کہ ان کے نزدیک صحتِ حدیث کا مدار صرف اسناد پر نہ تھا۔ بلکہ اسناد کے علاوہ ایک اور کسوٹی بھی تھی جس پر وہ احادیث کو پرکھتے تھے اور جس حدیث کے متعلق ان کو اطمینان ہو جاتا تھا کہ یہ حقیقت سے اقرب ہے اس کو قبول کر لیتے تھے خواہ وہ خالص محدثانہ نقطۂ نظر سے مرجوح ہی کیوں نہ ہو۔

یہ دوسری کسوٹی کونسی ہے؟ ہم پہلے بھی اشارۃً اس کا ذکر کر چکے ہیں کہ جس شخص کو اللہ تعالیٰ تفقّہ کی نعمت سے سرفراز فرماتا ہے اس کے اندر قرآن اور سیرتِ رسول کے غائر مطالعہ سے ایک خاص ذوق پیدا ہو جاتا ہے جس کی کیفیت بالکل ایسی ہے جیسے ایک پرانے جوہری کی بصیرت کہ وہ جواہر کی نازک سے نازک خصوصیات تک کو پرکھ لیتی ہے۔ اس کی نظر بحیثیت مجموعی شریعتِ حقہ کے پورے سسٹم پر ہوتی ہے اور وہ اس سسٹم کی طبیعت کو پہچان جاتا ہے۔ اس کے بعد جب جزئیات اس کے سامنے آتے ہیں تو اس کا ذوق اسے بتا دیتا ہے کہ کونسی چیز اسلام کے مزاج اور اس کی طبیعت سے مناسبت رکھتی ہے اور کونسی نہیں رکھتی۔ روایات پر جب وہ نظر ڈالتا ہے تو ان میں بھی یہی کسوٹی ردّ و قبول کا معیار بن جاتی ہے۔ اسلام کا مزاج عین ذاتِ نبوی کا مزاج ہے۔ جو شخص اسلام کے مزاج کو سمجھتا ہے اور جس نے کثرت کے

ساتھ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کا گہرا مطالعہ کیا ہوتا ہے وہ نبی اکرمؐ کا ایسا مزاج شناس ہو جاتا ہے کہ روایات کو دیکھ کر خود بخود اس کی بصیرت اسے بتا دیتی ہے کہ ان میں سے کونسا قول یا کونسا فعل میرے سرکار کا ہو سکتا ہے اور کونسی چیز سنت نبوی سے اقرب ہے۔ یہی نہیں بلکہ جن مسائل میں اس کو قرآن و سنت میں کوئی چیز نہیں ملتی ان میں بھی وہ کہہ سکتا ہے کہ اگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے فلاں مسئلہ پیش آتا تو آپ اس کا فیصلہ یوں فرماتے۔"

ان عبارتوں سے تین باتیں بالکل عیاں ہیں۔ ایک یہ کہ مصنف اپنے بارے میں یہ دعویٰ نہیں کر رہا کہ وہ مزاج شناس نبوت ہے بلکہ وہ فن حدیث کے ائمہ کے بارے میں ایک عام اصول بیان کر رہا ہے۔ دوسری بات یہ بیان ہوئی ہے کہ کتاب اللہ، سیرت نبوی اور آنحضورؐ کے ارشادات کے وسیع مطالعے اور مسلسل غور و تدبر سے ایسی مناسبت و مہارت پیدا ہو جاتی ہے کہ طالب حدیث اپنے ذوق سلیم اور وجدان صحیح کی مدد سے ایک حدیث کے الفاظ و معانی کو دیکھ کر یہ رائے قائم کر سکتا ہے کہ یہ نبی کا کلام ہو سکتا ہے یا نہیں۔ تیسری بات یہ بتائی گئی ہے کہ اس طرح کا ذوق نقد حدیث کا واحد معیار نہیں ہے بلکہ احادیث کے جانچنے میں جن متعدد ذرائع سے کام لیا جاتا ہے ان میں سے ایک ذریعہ یہ بھی ہے۔ اب ظاہر ہے کہ جو شخص ان عبارتوں سے یہ نتیجہ اخذ کرتا ہے کہ یہ ساری بحث مصنف نے اس لیے کی ہے کہ وہ مزاج شناسیٔ نبوت کا کوئی منصب وضع کر کے اس پر قابض ہونا چاہتا ہے تو اس شخص کے کذب و افترا اور دجل و تلبیس میں کیا شبہ ہو سکتا ہے۔

یہاں دو معقول سوال البتہ ضرور کیے جا سکتے ہیں۔ پہلا یہ کہ فی الواقع محدثین نے ایسی بات کہی ہے یا مولانا مودودی نے بلا وجہ ان کی طرف اسے منسوب کر دیا ہے، دوسرا یہ کہ اگر محدثین کی یہ رائے ہے تو یہ صحیح ہے یا غلط ہے؟ پہلے سوال کا جواب یہ ہے کہ تمام ائمہ حدیث نے اس اصول کو بیان کیا ہے۔ اور اس فنی ذوق کی بنا پر وہ بعض احادیث کے بارے میں کہہ دیتے ہیں کہ ھذا الحدیث علیہ ظلمۃ (و متنہ مظلم) (اس حدیث پر تاریکی چھائی ہوئی ہے یا اس کا متن تاریک ہے) بعض اوقات وہ کسی حدیث کو دیکھ کر کہتے ہیں "طبیعت اسے قبول کرنے سے ابا کرتی ہے"۔ یہاں زیادہ

آراء کا نقل کرنا تو محال ہے، البتہ چند حوالے ہم پیش کیے دیتے ہیں جنہیں حاکم نے اپنی مشہور کتاب "معرفۃ علوم الحدیث" میں نقل کیا ہے۔ ابن جوزی فرماتے ہیں: "منکر حدیث سنتے ہی عالم حدیث کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اور قلب متنفر ہونے لگتا ہے۔" ربیع ابن خثیم کا قول ہے کہ "اکثر حدیثوں میں روز روشن کا سا نور ہوتا ہے جس کے ذریعے سے ہم انہیں پہچان لیتے ہیں اور بعض احادیث پر رات کی سی تاریکی طاری ہوتی ہے جس کی وجہ سے ہمیں ان کی حقیقت معلوم ہو جاتی ہے۔ ابن دقیق العید کہتے ہیں "محدثین بعض اوقات کسی حدیث کے موضوع ہونے کا فیصلہ الفاظ کی بنا پر کرتے ہیں"۔ اور بلقینی اس کی تشریح یوں کرتے ہیں: "اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک خادم اپنے آقا کی سالہا سال تک خدمت کرتے کرتے اس کی پسند و ناپسند سے گہری واقفیت حاصل کر لیتا ہے۔ اب ایک شخص دعویٰ کرتا ہے کہ تمہارا آقا فلاں چیز ناپسند کرتا ہے حالانکہ خادم جانتا ہوتا ہے کہ میرے آقا کو یہ شے پسند ہے، چنانچہ وہ فوراً اس کی تکذیب کر دیتا ہے۔"

ان حوالوں سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ یہ حقیقت محدثین کے ہاں بالکل معروف اور مسلم ہے یہی وجہ ہے کہ منکرین حدیث کے ترجمان "طلوع اسلام" نے جب شروع شروع میں مولانا مودودی کی عبارت کو اپنے ہاں نقل کیا تھا تو حافظ محمد اسلم صاحب جیراجپوری نے طلوع اسلام ہی میں اس پر لکھا تھا کہ یہ بات مودودی صاحب نے نرالی نہیں کہی بلکہ محدثین سارے یہی کہتے چلے آتے ہیں اور ان کا یہ کہنا لوگوں کو خالص شخصیت پرستی کی دعوت دینا ہے۔ ابتدا میں بات اتنی ہی کہی گئی تھی لیکن جو مسائل سلف سے خلف تک مسلمات کے طور پر منتقل ہوتے چلے آئے ہیں، منکرین حدیث اور قادیانی اور اسی قماش کے دوسرے لوگ جب تک ان مسلمات کو جماعت اسلامی اور مولانا مودودی کی ایجاد قرار نہ دے لیں اور پھر جماعت اسلامی کو اچھی طرح کوس نہ لیں، اس وقت تک انہیں مزا ہی نہیں آتا۔ قتل مرتد، رجم زانی محصن، ملک یمین، ملکیت شخصی، ان میں سے آخر کونسا مسئلہ ایسا ہے جس کے بارے میں جماعت اسلامی نے کوئی ایسی بات کہی ہو جو چودہ صدیوں سے مسلمانوں میں متفق علیہ اور مجمع علیہ نہ رہی ہو۔

اب دوسرا سوال یہ رہ جاتا ہے کہ ائمہ حدیث کا یہ قول صحیح ہے یا نہیں کہ کثرت مطالعہ سے حدیث کی معرفت کا ملکہ پیدا ہو جاتا ہے، اس کا جواب یہ ہے کہ کائنات میں ہر شے کی اچھی، بری

کھوٹی، کھری، اعلیٰ، ادنیٰ مختلف اقسام پائی جاتی ہیں۔ ان اشیاء میں سے کسی شے کے استعمال میں اگر مداومت اور مزاولت کی جائے تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اصلی اور نقلی کی پہچان کی ایک فطری صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے اور نگاہ کسوٹی کا کام دینے لگتی ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے اور علم، عقل، تجربہ، مشاہدہ تمام اس حقیقت کی تصدیق کرتے ہیں اور اس حقیقت کا منکر وہی شخص ہو سکتا ہے جو بالکل ہٹ دھرم ہو اور جو حدیث کے مقام اور رسالت کے منصب کا اُسی طرح انکار کرے جس طرح کا انکار دونوں مذکورۂ بالا گروہ کرتے ہیں۔ یہ خیال کرنا بھی صحیح نہیں ہے (جیسا کہ جیراجپوری صاحب نے کہا ہے) کہ یہ معیار خالصتہً شخصی اور ہر محدث کے انفرادی ذوق کا آئینہ دار ہوگا۔ چونکہ احادیث کا ایک ہی ذخیرہ ہے جو اس ذوق کی تخلیق و تربیت کرتا اور اسے پروان چڑھاتا ہے۔ اس لیے فی الجملہ اس ذوق و وجدان میں ہم آہنگی اور یک جہتی کا پہلو نمایاں ہوتا ہے۔ اگر کہیں اختلاف ہو بھی تو چونکہ یہ ذوق نقدِ حدیث کا واحد معیار نہیں ہے اس لیے یہ خدشہ باقی نہیں رہتا کہ تنہا اس کے بل پر ہر محدث کا معیار انفرادی اور دوسرے محدثین سے مختلف ہو جائے گا۔

جہاں تک اس الزام کا تعلق ہے کہ مولانا اصلاحی صاحب نے تحقیقاتی عدالت میں مولانا مودودی کے دعوائے مزاج شناسیٔ رسول کو تسلیم کیا ہے، اس کی حقیقت یہ ہے کہ قادیانی وکلاء عدالت میں گواہوں سے ہر طرح کے اُلٹے سیدھے سوال کرتے رہے ہیں۔ چنانچہ مولانا اصلاحی صاحب کی شہادت کے دوران میں انہوں نے آپ پر یہ سوال کیا تھا کہ مزاج شناسِ رسول کی تعریف کیا ہے۔ مولانا اصلاحی صاحب نے اس کا جواب یہ دیا کہ مزاج شناسِ رسول وہ شخص ہے جو ایک نبی، غیر نبی اور جھوٹے نبی کے کلام میں امتیاز کر سکے۔ قادیانی وکیل نے اپنے مخصوص علمِ کلام سے کام لیتے ہوئے دوسرا سوال یہ کیا کہ کیا آپ مولانا مودودی کو مزاج شناسِ رسول سمجھتے ہیں۔ مولانا اصلاحی صاحب نے جواب میں فرمایا کہ "میرا حُسنِ ظن اُن کے بارے میں یہی ہے کہ وہ ایک نبی، غیر نبی اور جھوٹے نبی کے کلام میں امتیاز کر سکتے ہیں"۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس جواب پر منکرینِ حدیث اور منکرینِ ختمِ نبوت کو چھوڑ کر اور کون معقول آدمی اعتراض کر سکتا ہے۔ کیا مولانا اصلاحی اس کے جواب میں یہ کہتے کہ ان کا سوئے ظن مولانا مودودی کے بارے میں یہ ہے کہ وہ سچے اور

جھوٹے نبی کے کلام میں تمیز نہیں کر سکتے۔؟

مرزا غلام احمد اور مولانا مودودی کی عبارات میں مماثلت پیدا کرنے کی توقع بھی انہی لوگوں سے ہو سکتی ہے جو مقام رسالت سے قطعاً ناآشنا ہوں۔ مرزا صاحب نے جو دعویٰ کیا ہے وہ یہ ہے کہ نبوت و رسالت کا منصب حاصل کر لینے کی وجہ سے اللہ نے انہیں ایسا علم دے دیا ہے کہ وہ جس حدیث کو چاہیں اخذ کریں اور جسے چاہیں رد کر دیں۔ یہی موقف مرزا صاحب کا سارے احکام شریعت کے بارے میں ہے خواہ ان کا ماخذ قرآن ہو یا حدیث۔ جس شخص کے دماغ میں ذرہ بھر عقل اور دل میں رائی کے برابر خوفِ خدا ہو وہ اس بات کا جوڑ آخر اس بات سے کیسے ملا سکتا ہے جسے مولانا مودودی نے ایک اصول درایتِ حدیث کے طور پر نقل کیا ہے اور جسے تمام ائمہ فن مانتے چلے آئے ہیں۔

چند اشکالات

سوال :۔ میں اکثر اوقات اس پر غور کیا کرتا ہوں کہ کیا وجہ ہے کہ مرزا غلام احمد کو اپنے گمراہ کن مشن میں اس قدر کامیابی حاصل ہوئی مجھے مرزا صاحب کی کامیابیوں کا سلسلہ لامتناہی نظر آتا ہے اور جس وقت مرزا صاحب کے مخالفین کی نامرادیوں پر غور کرتا ہوں تو وہ بھی بے حد و حساب نظر آتی ہیں۔ ایسا کیوں ہے؟

ایک شخص خدا اور اس کے رسول کے مقابلہ پر کھڑا ہوتا ہے، تائیدِ رسولؐ کو چیلنج کرتا ہے کہ تم سب مل کر بھی میرے مشن کو فیل نہیں کر سکتے، کیونکہ خدا کی تائید میرے شاملِ حال ہے۔ تم جب بھی میرے مقابلہ پر آؤ گے، ہر مرتبہ ذلیل و نامراد ہوتے رہو گے، اور یہی میرے نبی ہونے کی سب سے بڑی دلیل ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ایسا ہی ہوتا ہے۔ مرزائیوں کی حفاظت کے سامان غیب سے پیدا ہو جاتے ہیں۔ ایک تازہ مثال دیکھیے کہ جھمیر کے حادثہ میں نجانے کتنے مسلمان لقمۂ اجل ہو گئے لیکن مرزا صاحب کے ایک ممتاز پیروکو خدا تعالیٰ نے بال بال بچا لیا۔ دوسری طرف مرزائیوں

کے مخالفین کی تباہی کے سامان بھی غیب سے ظہور میں آتے ہیں۔ جس کی ایک مثال لاہور کا نارشل لاء ہے۔ ذرا سچے رسولؐ کی ختم نبوت کی حفاظت کرنے والوں کی ناکامیاں اور تباہیاں سامنے لائیے! کس قدر زور دار تحریک اُٹھی تھی اور کیسے ہمیشہ کے لیے ختم ہو کے رہ گئی۔

پھر، اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں فرماتا ہے کہ اس سے بڑھ کر کون ظالم ہوگا جو خدا پر جھوٹ بولے۔ ایک دوسری آیت کا مفہوم یہ ہے کہ "اے نبی! اگر تم ہماری طرف سے ایک ذرا سا بھی جھوٹ گھڑ کر بیان کرو تو ہم تمہاری گردن پکڑ لیں"۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ اس سے پہلے کسی شخص نے خدا پر اتنا بڑا جھوٹ بولا ہو اور پھر وہ اس طرح اپنے مشن میں کامیاب بھی ہوا ہو۔ گذشتہ سال جو کچھ لاہور میں ہوا، کیا وہ سب کچھ اتفاقی طور پر ہو گیا؟ خدا کی مرضی اس میں شامل نہیں ہے کہ علماء کو جیل اور پھانسی، اور . . . . . ؟

امید ہے کہ اس سے آپ میری الجھن کو سمجھ لیں گے اور میری رہبری فرمائیں گے۔

جواب۔ یہ ایک دلچسپ سوال ہے، مگر اپنے اندر اس لحاظ سے اہمیت رکھتا ہے کہ اس طرح کے دھندلے دھندلے شکوک و شبہات بہت سے دلوں میں ہیں، اور خود مرزائی حضرات بھی اپنی تبلیغ میں یہ شکوک و شبہات پیدا کرتے رہتے ہیں۔ یہ سوال چند اصولی حقیقتوں کی وضاحت چاہتا ہے، جنہیں ہم ایک مناسب ترتیب سے سائل کی خدمت میں پیش کرتے ہیں۔

سب سے پہلے یہ بات ذہن نشین کر لیجیے کہ خدا کے دیے ہوئے علم حقیقت کی رُو سے حق و باطل کا معیار یہ نہیں ہے کہ کس موقعے پر کون مرا اور کون بچ نکلا، کون ابتلاء میں سے گذر رہا ہے اور کون مزے میں ہے۔ اگر یہ معیار ہوتا سچ اور جھوٹ کا، تو پھر مستقل سنت اللہ یہ ہوتی کہ موت فوت، حادثے، بیماری، قحط اور مصائب و شدائد کا شکار ہمیشہ اہل باطل ہوا کرتے، اہل حق کا کبھی بال بیکا نہ ہونے پاتا۔ آگ لگتی، گاڑیاں ٹکراتیں، بسیں الٹتیں، بجلیاں گرتیں، اور ایمان دار اور نیک لوگ بچا لیے جاتے، صرف کفار و فساق کا خاتمہ ہو جایا کرتا۔ اہل ایمان اور نیک لوگوں کو اول تو سیدھے زندہ آسمان پر اٹھا لیا جاتا، ورنہ پھر آخر انہیں موت آتی بھی تو بستر سکون و راحت پر آتی۔ حادثات روز آپ کے سامنے ہوتے ہیں اور ان میں

مسلم اور غیر مسلم، شریف اور شریر، ظالم اور مظلوم ہر طرح کے لوگ مرتے بھی ہیں، زخمی بھی ہوتے ہیں اور بچ بھی نکلتے ہیں۔

ہم یہ ضرور مانتے ہیں کہ نظامِ مشیت کے تحت جو ادنیٰ سے ادنیٰ طبعی حادثات انسانی زندگی میں واقع ہوتے ہیں ان میں اللہ تعالیٰ کی بے شمار حکمتیں اور مصلحتیں کارفرما ہوتی ہیں اور کوئی چیز بھی اندھا دھند طریق سے واقع نہیں ہوتی۔ لیکن یہ بات کہ یہ حوادث کسی کو اپنی لپیٹ میں لے کر اور کسی کو زندہ و سلامت چھوڑ کر اس کے برسرِ حق یا حق سے منحرف ہونے کا فیصلہ کرتے ہیں، ایک ایسا دعویٰ ہے جس کی تردید قرآن خود کرتا ہے۔ اور ایک جگہ نہیں، بار بار کرتا ہے۔ سوائے اُس عذابِ الٰہی کے عظیم حادثہ کے جو اپنی پوری شرائط کے ساتھ ظہور پا کر کسی قوم کی قسمت کا فیصلہ کرتا ہے اور جس کی لپیٹ سے بجز مومنین صالحین کے کوئی بچ کے نہیں نکل سکتا، اور کسی بھی حادثے کا شکار ہو جانا یا اس سے بچ نکلنا کسی کے ایمان و کفر اور کسی کی راستی و ناراستی کو نتھار دینے والا معیار نہیں ہے۔ لوگوں کا مرنا اور بچ نکلنا، بیمار پڑنا اور تندرست ہونا، کاروبار میں ترقی کر جانا یا پسپا ہونا، فراخ روزی پا لینا یا تنگ دستی سے دوچار ہو جانا، کوئی بازی جیت لینا یا کسی میں ہر جانا، ان کے عقیدہ و عمل اور ان کے فکر و کردار کی صحت و عدمِ صحت کی دلیل نہیں ہو سکتا۔ اس بارے میں اللہ کا قانون مہلت کا قانون ہے۔ قرآن اسے چند لفظوں میں یوں بیان کرتا ہے کہ

كُلًّا نُّمِدُّ هٰٓؤُلَآءِ وَهٰٓؤُلَآءِ مِنْ عَطَآءِ رَبِّكَ (بنی اسرائیل - ۲۰)

ہم سب کے سب لوگوں کو، اُن کو بھی (من کان یرید العاجلۃ) اور ان کو بھی (من اراد الاخرۃ) مدد دیتے ہیں تیرے پروردگار کی عنایت میں سے۔

یعنی ہر ایک کے لیے، چاہے اس کا عقیدہ و خیال اور مذہب و کردار کوئی ہو، میدان تگ و تاز کھلا چھوڑ دیا گیا ہے۔ اللہ نے مہلت کے دائرے میں کہیں بھی اپنے کسی قانون کی روک ایسی نہیں ڈالی جو باطل نظریات اور فاسد کردار رکھنے والوں کے لیے امتیازی طور پر آگے بڑھنے میں حائل ہو۔ کوئی جدھر بڑھنا چاہے بڑھتا جائے اور جہاں تک بڑھ سکتا ہو بڑھے۔ ایمان اور کفر، بھلائی اور برائی، راستی اور

ناراستی، عدل اور ظلم، طاعت اور استکبار، حق پرستی اور نفس پرستی کی دو گونہ راہیں ہر ایک کے لیے کھلی ہیں۔ اور سامنے کتبہ لگا ہے کہ من شاء فلیؤمن ومن شاء فلیکفر۔

یہ صورت اگر نہ ہوتی بلکہ کفر اور ناراستی اور ظلم کا رویہ اختیار کرنے والوں کو طبعی حوادث کے ذریعے دھر لیا جاتا تو خود قرآن ہی بتاتا ہے کہ انسان کی وہ آزادیٔ انتخاب ختم ہو جاتی جو اسے ذمہ دار ہستی بنا کر قابلِ سزا یا سزاوارِ جزا بناتی ہے۔ پھر تو نظامِ تقدیر کے تحت "اکراہ فی الدین" کی حالت قائم ہو جاتی کہ جیسے شجر و حجر اور مہر و قمر اللہ کے حضور طوعاً و کرہاً مسلم بنے کھڑے ہیں، انسان بھی بلا ارادہ و انتخاب مسلم و مطیع ہوتا۔

بات اتنی ہی نہیں کہ آدمی کو فکر و عمل کی دنیا میں دونوں سمتوں میں آگے بڑھنے کا موقع فراہم کیا گیا ہے، بلکہ اس سے آگے بڑھ کر یہ بھی قرآن کی واضح کردہ حقیقت ہے کہ جو لوگ کفر اور بغاوت اور انحراف اور استکبار کی راہ اختیار کر لیتے ہیں ان کو اور زیادہ چھوٹ ملتی ہے۔ جیسے کہ فرمایا: وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِّنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ وَاُمْلِيْ لَهُمْ ۭ اِنَّ كَيْدِيْ مَتِيْنٌ ۝ (الاعراف ۱۸۲، ۱۸۳) دوسری جگہ فرمایا: فَذَرْنِيْ وَمَنْ يُّكَذِّبُ بِهٰذَا الْحَدِيْثِ ۭ سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِّنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ وَاُمْلِيْ لَهُمْ ۭ اِنَّ كَيْدِيْ مَتِيْنٌ (القلم - ۴۴، ۴۵) مزید صراحت کے لیے ملاحظہ ہو: مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعَاجِلَةَ عَجَّلْنَا لَهٗ فِيْهَا مَا نَشَاۗءُ لِمَنْ نُّرِيْدُ ثُمَّ جَعَلْنَا لَهٗ جَهَنَّمَ (بنی اسرائیل - ۱۸)

جیسے ماہی گیر کا ٹانکا نگل جانے والی مچھلی کو ڈور ڈھیلی چھوڑ چھوڑ کر تگ و تاز کا موقع دیتا ہے، ایسے ہی قانونِ مشیت کا معاملہ گمراہ مفسدین کے ساتھ ہوتا ہے۔ یہ سرکش مچھلیاں بظاہر پانی میں سَل سَل کرتی دُور تک جا پہنچتی ہیں اور یہ سمجھتی ہیں کہ ہماری تگ و تاز میں کون رکاوٹ بن سکتا ہے، لیکن حال یہ ہوتا ہے کہ کانٹا حلق کو بیندھ چکا ہوتا ہے اور ڈور ایسے شکاری کے ہاتھ میں ہوتی ہے جو شکار کے گہرے داؤں کو کام میں لا رہا ہوتا ہے۔ سرکشوں اور گمراہوں کے لیے الٰہی مشیت کا خاص رویّہ ہے کہ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى، یعنی جدھر وہ بہک کے چل کھڑے ہوئے، خدا کے قوانین اُدھر ہی ان کو آگے اور آگے لیے چلے جاتے ہیں یہاں تک کہ نوبت نصلیہ جہنم تک پہنچتی ہے۔

دوسری یہ حقیقت پیشِ نظر رہے کہ مسلمانوں کے عام کرب و اضطراب کے باوجود قادیانیوں کا اُن پر مسلط رہنا اور اُن سے اپنے اجتماعی وجود کو نجات دلانے میں اُن کا ناکام ہونا اپنے پیچھے چند ایسے نمایاں وجوہ رکھتا ہے کہ جن سے ہم لوگ چاہے کتنا ہی صرفِ نظر کریں، الٰہی قانون بہرحال ان کو سامنے رکھ کر کام کرتا ہے۔ وہ نمایاں وجوہ یہ ہیں:-

۱- جس سچے نبیؐ کو مسلمان مانتے ہیں اور آخری نبیؐ مانتے ہیں، اور جس کی شمع ناموس کے پروانے بن بن کر قربانیاں دیتے نظر آتے ہیں، اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگیوں میں اسی نبیؐ کی نورانی ہدایت، اس کی سچی تعلیم، اس کے لائے ہوئے نظامِ فلاح سے کھلا کھلا انحراف کرتے ہیں، اس نبیؐ کی سنت کی دھڑلے سے مخالفت کرتے ہیں، اس کے سکھائے ہوئے اصولِ حیات کا مذاق اڑاتے ہیں، اس کی پیش کردہ معاشرت و تہذیب کے خلاف دلیل بازی کرتے ہیں، اس کے دین کے علمبرداروں کو کچلتے ہیں اور احیائے اسلام کی تحریکوں پر تشدد کرتے ہیں۔

پھر کیا بعید کہ اس تضاد پر ایک سزا کے طور پر ان کے اندر سے مشیت نے ایک خاص فتنے کو اُبھرنے کا اور ان کے اپنے معاشرے میں پھلنے پھولنے کا موقع دیا ہو۔ کیا یہ کوئی معمولی ابتلاء ہے کہ ایک قوم اپنی آزادانہ ریاست رکھتے ہوئے اس کرب و اضطراب سے نجات نہ پاسکے جس میں وہ پچاس برس سے مبتلا ہے۔ خدا کے بھیجے ہوئے نبیؐ صادق کے مقابلے میں قوم کی شانِ انحراف یقیناً یہ رنگ بھی لاسکتی ہے کہ وہ جعلی نبوت کے فتنے کو بھگتے۔

۲- آپ دیکھتے ہیں کہ پاکستان کی مسلمان قوم جو قادیانیوں کو اقلیت قرار دلوا کر اُن سے پیچھا چھڑانے کی جدوجہد کرتی ہے، خود اسی کا پالا پوسا ملحد اور مذہب دشمن عنصر ہے جو قادیانیوں کی سرپرستی کرنے پر بضد ہے۔ یہ عنصر معاشرے میں جو غلبہ و اثر رکھتا ہے وہ اسی پاکستانی قوم کے تعاون سے اسے حاصل ہوا ہے، اور اسی کے تعاون سے قائم ہے۔ گویا یہ قوم ایک ہاتھ سے جس جھاڑ کے کانٹوں سے اپنا دامن چھڑانا چاہتی ہے، دوسرے ہاتھ سے اسی کی جڑوں کو پانی بھی دیتی ہے۔ ایسی دوزنگی کی روش کا مظاہرہ کرنے پر اللہ تعالیٰ کے ہاں سے بجز اس کے اور کونسا

جواب مل سکتا ہے جواب تک ملا ہے۔

۳۔ پھر حصولِ مقصد کے لیے اب تک جو جدوجہد ہوئی ہے، اس کے بارے میں جرأت کے ساتھ یہ تلخ حقیقت ہمیں مان لینی چاہیے کہ اس میں ایسے پہلو بہت بڑے پیمانہ پر موجود تھے جن کا روادار خود اسلام نہیں اور جن سے اللہ اور اس کا رسول کبھی راضی نہیں ہو سکتے۔ اس جدوجہد میں اخلاص کے ساتھ مفاد پسندی، راستی کے ساتھ چالبازی، ایثار کے ساتھ ریا، اسلامی کردار کے ساتھ پستیٔ اخلاق، غیرت کے ساتھ بزدلی اور نظم کے ساتھ ہڑبونگ کی بہت بڑی آمیزش موجود تھی۔ اندریں حالات جس خدا نے اُحد اور حنین میں امت کی بہترین ہستیوں کی ذرا سی بشری لغزشوں پر شدید گرفت کی تھی، وہ اس جدوجہد ہی کے بارے میں اپنی سنت کیوں بدلنے لگا!

یہ تینوں وجوہ وبال اگر سامنے رکھ کر آپ از سرِ نو مسئلہ پر غور فرمائیں تو یقیناً آپ کا ذہن اس نتیجے پر نہ پہنچے گا جس کو آپ نے اپنے خط میں پیش کیا ہے۔

تیسری بات یہ سمجھ لیجیے کہ مذہبوں، جماعتوں، تحریکوں اور اجتماعی منظم فتنوں کے معاملے کا فیصلہ ہونے میں کافی دیر لگتی ہے۔ ایک اجتماعی تحریک یا ایک منظم فتنہ کے لیے تاریخ میں سو پچاس سال کا دور بہت چھوٹی سی چیز ہوتا ہے۔ ان بڑے معاملوں میں نتائج بڑی دھیمی تدریج سے نکلتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے ہاں سے فیصلے بڑا وقت لے کے صادر ہوتے ہیں۔ قرآن خود بتاتا ہے کہ تعرج الملئکۃ الیہ فی یوم کان مقدارہ خمسین الف سنۃ، یعنی بسا اوقات اجتماعی مسائل کی ابتدا و انتہا کے درمیان پچاس پچاس ہزار برس کا پٹیا ہوتا ہے۔ اس میدان میں اترنے والوں کے حوصلے بڑے لمبے ہونے چاہئیں۔ یہاں قانونِ مشیت یہ ہے کہ مختلف عقائد، نظریے، مسلک، مذہب، تحریکیں، تنظیمیں، فرقے، فتنے، حکومتیں، قیادتیں، اپنے پورے پورے فطری برگ و بار لانے کا موقع پائیں۔ جو جو کچھ خیر، اور جیسا جیسا کچھ شر ان کی فطرت میں مضمر ہو اسے وہ تاریخ کی کھیتی میں پنپ کر اچھی طرح اگل دیں۔ بیج سے پھل تک کا یہ سارا فاصلہ طے ہو چکتا ہے تو پھر مشیت کا باغبان یہ فیصلہ کرتا ہے کہ کس درخت کو میٹھا پھل دینے کی وجہ سے باڑ لگا کر محفوظ رکھنا ہے اور کس کو زہریلے کانٹے بکھیرنے کی وجہ سے لکڑہارے کے کلہاڑے کے حوالے کرنا ہے۔

اہلِ حق اور اہلِ باطل کے درمیان لمبی کشمکش ہوتی ہے اور فریقین کے حالات میں بڑے بڑے اُتار

چڑھاؤ ہوتے رہتے ہیں۔ اس کشمکش کے دوران میں حالات کی کسی ایک لہر یا واقعات کی کسی ایک کروٹ کو دیکھ کر قطعی حکم نہیں لگایا جا سکتا کہ بس اب آخری فیصلہ ہو گیا۔ اجلِ مسمّیٰ کے پردۂ غیب سے نمودار ہو جانے سے قبل کسی بازی کو جیتنے والے نہ جانے جان و مال کے کتنے ہی داؤں ہار چکتے ہیں تو جب کہیں جا کر کھیل کا آخری نتیجہ سامنے آتا ہے۔

خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تحریک کو مکّہ کے لمبے دَور میں جن دردناک آزمائشوں کا، اور محض ظاہر کو دیکھنے والی آنکھوں کے لیے "ناکامیوں" کا سامنا کرنا پڑا ہے، اگر بعد کے واقعات سے اس دَور کو منقطع کر کے دیکھا جائے ــــ اور مکّہ کے مخالفینِ حق کا قصورِ فہم تھا بھی یہی ــــ تو بظاہر یوں نظر آتا ہے کہ جیسے بت پرست مشرکوں کے لیے کامرانی ہی کامرانی ہے اور حق پرستوں کے لیے تنگیٔ معاش ہے، مار پیٹ ہے، تذلیل و استہزاء ہے، مقاطعہ ہے، نظربندی ہے، ہجرت ہے، قلتِ تعداد کی پریشانی ہے، اور مستقبل ہے کہ بظاہر نامعلوم ہے۔ لیکن بظاہر اس مایوس کن اور ناکامیوں بھرے ماحول کے بطن میں ایک زرّیں مستقبل پرورش پا رہا تھا کہ جب وہ نمودار ہو گیا تو ہر کودن سے کودن آدمی نے سمجھ لیا کہ وہ ۱۳ برس کا طویل دورِ ابتلاء سرتاسر کامیابی تھا، ناکامی کا کوئی شائبہ بھی اس میں شامل نہ تھا۔

آج بھی آپ اگر اجتماعی فضا میں حق و باطل کی کسی کشمکش کا مطالعہ فرمائیں تو پیروانِ حق کو آزمائشوں سے گزرتے، چوٹیں کھاتے اور بظاہر ان کی مساعی کے کئی ریلوں کو برباد جاتے دیکھ کر جلد باز نہ رائے قائم کرنے میں برسرِ حق نہ ہونگے کہ بس ان لوگوں کے ساتھ سرے سے حق ہے ہی نہیں، اور ان کے حریف ہی راستی پر ہیں۔ بشری ذہن مستقبل قریب یا بعید کے ان امکانات پر حاوی ہی نہیں ہو سکتا جو حالات کی کسی پلٹی کے ساتھ ظہور میں آنے والے ہیں۔

چوتھی بات یہ قابلِ ذکر ہے کہ امتِ محمدیہ کی تاریخ میں آج سے پہلے جو فتنے نمودار ہوتے رہے ہیں ان کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جتنی جعلی نبوتیں اُٹھیں، جتنے باطل نظریات اُبھرے، جتنے گمراہ فرقے ظہور میں آئے وہ سب کے سب کچھ عرصہ کے لیے بظاہر خوب پھلے، انہوں نے پیرووں کی ایک تعداد پیدا کی، انہوں نے عارضی تنظیمی استحکام حاصل کیا، انہوں نے شاہی درباروں اور محلوں میں مقامِ اعتبار پا لیا، اور انہوں

نے اہلِ حق کو دبانے اور ستانے میں بظاہر بہت کچھ کر کے دکھایا۔ لیکن فتنے قرآن کی زبان میں شجرۂ خبیثہ ہوتے ہیں کہ جن کی ساری بہار سطحِ زمین کے اوپر ہی اوپر ہوتی ہے، جڑ اندر نہیں اترتی۔ بالکل ایسے جیسے گندگی کے ایک ڈھیر پر رات ہی رات میں پدبھیڑوں کا ایک باغ لگ جاتا ہے لیکن ناپائدار ہوتا ہے۔ چنانچہ فتنے اُبھرے اور مٹ مٹا گئے، لیکن دینِ حق کی اصل قدریں جیسے تھیں، ویسی ہی رہیں۔ مسیلمہ کذاب اور حسن بن صباح کے اٹھائے ہوئے طومار ہوں، یا مانعینِ زکوٰۃ اور نظریۂ خلقِ قرآن کے حاملین کے چھوڑے ہوئے شوشے، ان میں سے ہر ایک کچھ دیر کے لیے ضرور ایک ابھرتی ہوئی طاقت بنا ہے لیکن بہت جلد دن پورے کر کے قافلۂ ایام کا غبار بن کر اُڑ گیا۔

قادیانیت کا معاملہ بھی بالکل ایسا ہی ہے۔ اسے جتنا ابھرنا تھا، ابھر چکا۔ اب اس کے زوال کے آثار چشمِ بینا پر بالکل عیاں ہیں۔ اوّلاً یہ کہ اس کا دورِ توسیع ختم ہو چکا ہے۔ آج سے پندرہ برس پہلے اس کی فتوحات کی جو رفتار تھی ــــ خصوصاً اس کے اوّلیں میدان، یعنی پنجاب میں ــــ وہ اب چوتھائی بھی نہیں رہی۔ ثانیاً اب قادیانی دعوت کے بارے میں عام فضا کچھ معلوم کرنے کی فضا نہیں ہے، بلکہ سب کچھ معلوم کر چکنے کے بعد نفرت کی فضا بن چکی ہے۔ بخلاف حق کی دعوت کے، کہ اس کے واضح ہو جانے پر جہاں مفاد پرست اشرار مخالفت اور نفرت کا ردِ عمل دکھاتے ہیں، وہاں ذہین شرفاء میں سے مسلسل ایک عنصر اس کے اصولوں اور اس کی اخلاقی قدروں کے آگے مفتوح ہوتا چلا جاتا ہے، یہاں اب صورت یہ درپیش ہے کہ چند مفاد پرست اور مخالفینِ دین (یا کم سے کم بے دین) قسم کے افراد کے علاوہ جمہورِ مسلمین قادیانیت سے فیصلہ کن حد تک بیزار ہو چکے ہیں۔ معاشرے کی رائے عام کی عدالت اب تحقیق کے مرحلے سے گزر کر فیصلہ دے رہی ہے۔ ثالثاً، قادیانی حضرات بھی اس پوزیشن کے پیدا ہوتے ہوتے اب "دعوت" پر دار و مدار رکھنے اور رائے عام کو دلائل سے فتح کرنے کے بجائے اپنی معاشی قوتوں، اپنے عہدوں اور اپنی ملازمتوں اور اپنی سازشی تدبیروں کے ساتھ عام مسلمانوں سے معرکہ لڑنے پر اتر آئے ہیں۔ اب تو قوت کی جو کچھ پونجی ان کے پاس ہے وہ اس کو ایک سوشل تصادم میں جھونک رہے ہیں۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ دعوت کی کھلی کھلی ناکامی کا آغاز ہو گیا۔ معاشی دباؤ،

عہدوں کے زور اور سازشوں کے بل پر کوئی عقیدہ و مسلک انسانی قلوب کو فتح نہیں کر سکتا۔ ان طریقوں کا ردِّ عمل ایسے فتنوں کے لیے مہلک ہوتا ہے۔

پانچویں بات یہ بھی واضح رہنی چاہیے کہ ایک عوامی مطالبہ کو دلائل کی بجائے قوت سے دبا دینا کبھی بھی اسے ختم نہیں کر سکتا۔ ایسے مطالبوں کے نخلِ شاداب کو تشدد کی بجلیاں ایک بار لٹھ مٹھ بنا کے رکھ دیں، تو یہ پھر اپنی کونپلیں نکال لیتے ہیں۔ افریقہ میں سفید اور رنگیں نسل کی کشمکش کو دیکھ لیجیے۔ سالہا سال سے رنگیں نسل کے مطالبۂ مساوات کو کچلا جا رہا ہے اور پوری پوری طاقت سے کچلا جا رہا ہے، مگر وہ ایک لحظہ کے لیے بھی نہیں مٹا۔ اسے دبانے والے بار بار دباتے ہیں لیکن وہ بار بار زور شور سے ابھرتا ہے۔ وہ اسی طرح ابھرتا رہے گا، تا آنکہ وہ حالات پر فتح پالے۔ ایسا ہی معاملہ یہاں بھی درپیش ہے۔

سب سے آخر میں سورۃ الحاقۃ کی مشہور آیات "ولو تقوّل علینا . . . ." (۴۴، ۴۵، ۴۶، ۴۷) کے بارے میں آپ کی اس غلط فہمی کا ہم ازالہ کرنا چاہتے ہیں جو قادیانی مکتبِ تفسیر ہی نے پھیلائی ہے۔

پہلے ان آیات کو سامنے رکھیے:۔

ولو تقوّل علینا بعض الاقاویل لا	اور اگر وہ (نبی صلعم) گھڑ لاتا ہم پر کوئی بات، تو ہم
لاخذنا منه بالیمین ۱ ثم لقطعنا منه	اس کا داہنا ہاتھ پکڑ لیتے اور اس کی شاہ رگ کاٹ
الوتین ۲ فما منکم من احد عنه حاجزین	ڈالتے!

اب اس کے مفہوم کو سرسری طور سے کسی معاملے پر منطبق کرنے کے بجائے کسی قدر غور و فکر سے کام لیجیے۔ ایک دوسرے سے ملتی جلتی ایک جرم کی دو مختلف صورتیں ہیں کہ جن میں سے یہ ایک کی سزا ہے اور قادیانی مفسّرین اسے دوسری پر چسپاں کرتے ہیں۔

ایک صورت یہ ہو سکتی ہے کہ ما سوائے انبیاء کے عام لوگ اللہ تعالیٰ کے ذمے کوئی غلط بات لگائیں اور اس سے یا اس کے دین سے کسی من گھڑت شے کو منسوب کریں۔ اس کی بے شمار شکلیں ہیں۔ کسی غلط عقیدے اور نظریے کو خدا کے دین یا الٰہی شریعت کے نام سے پیش کرنا، اپنی ذاتی رائے کو آسمانی ہدایت کی حیثیت سے سامنے لانا، خدا کی کتاب سے دانستہ ایسی بات نکال دکھانا جو اس کا

مدعا نہ ہو، اپنی مذہبی ٹھیکیداری چلانے اور دنیوی فائدے اٹھانے کے لیے غیر واجب فتوے اور احکام بالکل شارع کی طرف سے پیش کر دینا، اور ازاں جملہ اپنے آپ کو یا کسی دوسرے کو خدا کی طرف سے غلط طور پر کسی خاص منصب پر مامور قرار دینا، یہ سب امور ایسے ہیں جو انبیاء سے نہیں، غیر انبیاء سے تعلق رکھتے ہیں۔

دوسری صورت یہ ہو سکتی ہے کہ ایک شخص جسے خدا نے نبوت کا ذمہ دارانہ منصب دیا ہو اور جسے اپنی ہدایت کے پہنچانے کے لیے منتخب کیا ہو، اور جس کے حرف حرف کو دنیا میں من جانب اللہ ہونے کی بنا پر سندِ قبول حاصل ہو، وہ اگر اپنے منصب میں بددیانتی دکھا کر اپنی طرف سے کچھ چیزیں خدا کے دین اور خدا کے حکم کے نام سے میدان میں لائے تو معاملہ زیادہ سنگین ہو جاتا ہے۔ اس میں ایک جرم تو وہی رہتا ہے جو اوپر بیان ہوا، اور دوسرا اس سے بڑا جرم منصبِ نبوت میں بددیانتی اور دینِ حق کی امانت میں خیانت کا شامل ہو جاتا ہے۔

جرم کی پہلی صورت بہت ہی عام رہی ہے اور آج بھی ہے۔ تمام جھوٹے مذاہب، مشرکانہ عقائد، تحریف شدہ احکام و شرائع، نفس پرستانہ آراء، دنیا طلبی کے لیے لکھے ہوئے فتوے اور ان کے ساتھ ساتھ جعلی مناصب کے دعوے جو اللہ اور اس کے دین کے نام سے دنیا کے سامنے لائے جاتے رہے ہیں، اور جن سے بنی اسرائیل اور مشرکینِ عرب کی تاریخ بھری پڑی ہے جس پر خود قرآن نے نہایت وضاحت سے تبصرے کیے ہیں، بلکہ خود مسلمانوں میں بھی اس جرم کے مختلف نظائر کچھ کم موجود نہیں ہیں، یہ سب کچھ "افتراء علی اللہ" کے زیرِ عنوان داخل ہے۔ لیکن آپ دیکھتے ہیں کہ افتراء علی اللہ کی یہ ساری صورتیں عمل میں لانے والے لوگ بار بار سامنے آتے رہے، حتیٰ کہ نبوت کے جھوٹے دعوے بھی ایک بار نہیں، بار بار ہوئے، لیکن آیاتِ مذکورہ کے مطابق کبھی ایسا نہیں ہوا کہ جہاں کوئی یہ جرم کرتا فوراً مشیتِ الٰہی کا دستِ غیب حرکت میں آتا اور مجرم کے داہنے ہاتھ کو گرفت میں لے کر اس کی شاہ رگ کاٹ ڈالتا۔ افتراء علی اللہ کے مجرمین نے بڑی بڑی لمبی عمریں پائی ہیں اور بڑے بڑے لمبے دوران کے مذہبی کاروبار نے گزارے ہیں۔ معلوم ہوا کہ یہ آیات افتراء علی اللہ کی ان عام صورتوں سے تعلق نہیں رکھتیں۔ یہ صرف دوسری صورت کے لیے ہیں کہ اگر (محض امکانِ مفروضہ کی حد تک) اللہ کا کوئی مامور نبی نبوت پر

فائز ہونے کے بعد اپنے منصب میں خیانت کرے تو اس کے ساتھ یہ معاملہ ہو۔ لیکن انبیاء اپنی فطرت سلیمہ کی وجہ سے چونکہ معصوم ہوتے ہیں، لہٰذا اس کی کوئی نظیر موجود نہیں ہے۔

آپ پوچھ سکتے ہیں کہ پھر اس سزا کو بیان کرنا بھی کیا ضرور تھا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اس سزا کے تذکرے سے مقصود الٰہی انتظام کے قابل اعتماد ہونے کو واضح کرنا ہے جس کے تحت خدا کی طرف سے اس کا دین اور اس کی ہدایت بندوں کو پہنچائی جاتی ہے، اور ان مغالطوں کو رفع کرنا ہے جو نبی کے بارے میں نبی کے مخالفین میں پائے جاتے ہیں۔

یہ پروپیگنڈہ حضرت خاتم النبیین کے بارے میں مخالف حلقوں میں بہت شائع و ذائع تھا کہ "اجی کیا ہے، محض زورِ ادب ہے اور شاعرانہ حسن بیان!" کوئی کہتا "اس شخص پر جن آتا ہے جو اس کے اندر سے بولتا ہے، یا ایک مجنونانہ کیفیت میں یہ ساحرانہ کلام کرنے لگتا ہے اور اسے من جانب اللہ کہہ کر پیش کرتا ہے"۔ ایک خیال یہ تھا کہ "یہ سب کہانت ہے، کاہن لوگ ایسی ہی فوق العام باتیں اور انوکھے نکتے بیان کیا کرتے ہیں"۔

سورۂ الحاقہ میں (اور دوسرے مقامات پر بھی) اس پروپیگنڈے کی تردید کی گئی ہے۔ فرمایا: وَمَا هُوَ بِقَوْلِ شَاعِرٍ، یہ کسی شاعر کی شاعرانہ ادب طرازی نہیں ہے۔ قَلِيلًا مَّا تُؤْمِنُونَ: تم ہی ایمان لانے میں کوتاہ ہو۔ وَلَا بِقَوْلِ كَاهِنٍ: یہ کسی فال گیر کی نکتہ آرائیاں بھی نہیں ہیں۔ قَلِيلًا مَّا تَذَكَّرُونَ تم ہی استفادہ کرنے میں کوتاہ ہو! تَنزِيلٌ مِّن رَّبِّ الْعَالَمِينَ: یہ پیغام، یہ کلام، یہ نقشۂ زندگی، یہ دین، یہ قرآن تو خود رب العٰلمین کا اتارا ہوا ہے۔

تنزیل کا ذکر آیا تو مخاطبین کے ذہنی پس منظر کو سامنے رکھنے کی وجہ سے نظامِ تنزیل کے قابل اعتماد ہونے کو بھی واضح کر دیا۔ اس مقصد کے لیے اوپر یہ آیا کہ اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ: نبی تک اسے لانے اور لفظ لفظ اسکے سپرد کرنے پر ایسا قاصد مامور ہے جو "کریم" ہے، کوئی تیسرے درجے کا ناقابلِ اعتماد فرد نہیں۔ پھر آخر میں اور زیادہ زور سے یہ بتا دیا کہ اس الٰہی قاصد سے لے کر خدا کی ہدایت کو تم تک پہنچانے والا ذریعہ اور بھی زیادہ امانت دار ہے۔ ورنہ اگر وہ اس معاملے میں ذرہ بھر بھی خیانت

کرے تو معاً اسے ہم اپنی پکڑ میں لے لیں، پھر کوئی طاقت اسے ہماری گرفت سے چھڑانے والی نہیں ہو سکتی۔ دوسری جگہ اس نظامِ تنزیل کے مزید کچھ پہلوؤں کا تذکرہ بھی کیا گیا ہے۔ یعنی کسی نبی کی بعثت پر جب نزولِ وحی کا کوئی دَور شروع ہوتا ہے تو ملأ اعلیٰ کے چوکی پہرے کا انتظام کڑا ہو جاتا ہے پھر کاروانِ وحی اور جلوسِ الہام جن راہوں سے گزرتا ہے اُن کو شیاطین کے گذر سے پاک رکھنے کا شدید اہتمام کیا جاتا ہے۔ دینِ حق میں کسی آمیزش یا مداخلت کے امکانات بالکل ختم کر دیے جاتے ہیں۔ نبی اس سلسلہ کی آخری کڑی ہوتا ہے اور اس کے قلب و فکر کی بھی پوری پوری نگرانی و حفاظت کی جاتی ہے۔ اسی حقیقت کو ان آیات میں اجاگر کیا گیا ہے۔

قرآن میں یہ بات جس اسلوب سے کہی گئی ہے وہ انسانی زندگی میں بھی کثرت سے استعمال ہوتا ہے اور ہم سب اس کا تجربہ رکھتے ہیں۔ ایک دیانت دار تاجر اپنے مال کے بے آمیز ہونے پر یقین رکھتے ہوئے متذبذب گاہک کو اطمینان دلانے کے لیے کہتا ہے کہ اگر اس میں ملاوٹ نکلے تو ہم سارے مال کو آگ لگا دیں۔ ایک باپ جب اپنے بیٹے کی نجابت پر کامل بھروسہ رکھتا ہے تو وہ کسی شکایت کرنے والے سے یوں کہتا ہے کہ میرے بیٹے نے اگر ایسی بات کہی ہو تو میں اس کی زبان گدی سے کھینچ نہ لوں۔ ایک آقا اگر اپنے ملازم کی شرافت پر اعتماد کرتا ہے تو اس اعتماد کو دوسروں تک منتقل کرنے کے لیے وہ اس اسلوب میں بات کرتا ہے کہ اگر یہ ایک پیسے کی گڑبڑ کرے تو میں ابھی اسے کان پکڑ کے نکال دوں۔

نبی کے لیے ایک یہی انتباہ قرآن میں نہیں آیا، بلکہ اور مقامات پر دوسرے پہلوؤں سے بھی انتباہ موجود ہیں۔ مثلاً ایک انتباہ مشرکین اور اہلِ کتاب کی اہواء کے اتباع کے بارے میں ہے، سورۂ بقرہ میں دو مقامات (آیات ۱۲۰، ۱۴۵) پر یہود و نصاریٰ کے متعلق اور سورۂ رعد میں مشرکین کے متعلق نبی صلعم کو متنبہ کر دیا گیا ہے کہ خبردار، ان کی رضا جوئی کے لیے ان کی پسند و ناپسند کے پیچھے نہ چلیے گا، ورنہ مالك من الله من ولی ولا نصیر (بقرہ - ۱۲۰) انك اذاً لمن الظٰلمین (بقرہ ۱۴۵) مالك من الله من ولي ولا واقٍ (رعد - ۳۷) کتنی سخت دھمکی ہے۔ یعنی خدا اور بندے کا

سارا تعلق ختم! ایسا ہی ایک انتباہ سورۂ بنی اسرائیل (آیات ۷۳، ۷۴، ۷۵) میں موجود ہے۔ یہاں ذکر ہے مشرکین کی طرف سے سمجھوتے (COMPROMISE) کی ایک زوردار کوشش کا۔ اس کے بارے میں فرمایا کہ اگر ہم تمہیں سہارا دے کر اپنی جگہ جما نہ رکھتے تو تم کچھ نہ کچھ جھک پڑتے۔ اور اگر ایسا ہو جاتا تو؟ — تو لاذقنٰک ضعف الحیٰوۃ وضعف الممات: ہم تمہیں زندگی میں بھی عذاب کا مزہ چکھاتے اور مرنے میں بھی۔ ثم لا تجد لک علینا نصیرا: پھر ہمارے مقابلے میں تمہیں کوئی مدد کرنے والا بھی نہ ملتا۔

اب آپ دیکھیے کہ کفار اور مشرکین کی اہواء کا اتباع کرنے والے بھی غیر انبیاء میں عام ہیں اور دائرۂ مذہب میں دشمنانِ حق سے سمجھوتے کرنے والوں کی بھی کثرت ہے، لیکن کسی کے ساتھ ان دھمکیوں کے مطابق نمایاں طور پر عبرتناک معاملہ نہیں ہوتا۔ اس لیے کہ فوری گرفت اور فوری انقطاعِ علاقہ اور فوری سزا کی یہ دھمکیاں نبی کے لیے خاص ہیں۔ ممنوع یہ امور ہر غیر نبی کے لیے بھی ہیں، لیکن ان کے بارے میں یہ انتباہ خاص طور پر نبی کے لیے ہیں۔ "ولو تقوّل" کی دھمکی بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ خدا کے بارے میں بہتان اور افترا گھڑنا جرم تو غیر نبی اور جھوٹے نبی کے لیے بھی ہے، لیکن یہاں جس گرفت سے ڈرایا گیا ہے وہ صرف سچے نبی کے لیے ہے۔

پس جو ڈھیل آپ کسی مدعی کاذب کو ملتی دیکھتے ہیں وہ تو اس آیت کی روشنی میں اس کے جھوٹا ہونے کی صریح دلیل اور علامت بنتی ہے۔

خدا کرے کہ یہ بحث آپ کے لیے اپنا ذہن صاف کرنے میں مدد دے۔

(بقیہ صفحہ ۳۰۷) پہلو کا تقابل کر کے پورے سائنٹفک اسلوب سے یہ حقیقت نمایاں کر دی ہے کہ اسلام تصورِ کرسی کے مغربی تصور سے قطعی بُعد و منافات رکھتا ہے۔ اس موضوع پر درحقیقت یہ مقالہ علم و فکر کی دنیا میں ایک قابل قدر اضافہ ہے اور ہماری دلی خواہش ہے کہ تعلیم یافتہ حضرات اسے غور سے پڑھیں۔